حلال اور حرام کو حرام ہی سمجھتے رہیں مگر ان میں روز بروز ایسے افراد کی تعداد بڑھتی چلی جائے جو فرض کو فرض جانتے ہوئے ادا نہ کریں، حکم کو حکم مانتے ہوئے اس کی تعمیل نہ کریں، اور حرام کو حرام سمجھتے ہوئے اس میں خفیہ اور علانیہ مبتلا ہوں، تو اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ ہم اپنی آبادی کو روز بروز زیادہ منافق بنا رہے ہیں، اس کے کیرکٹر کی بنیادیں ڈھیلی کر رہے ہیں، اس کے اندر سے فرض شناسی اور پابندیِ قانون کی جڑیں کاٹ رہے ہیں، اور اس کو یہ تربیت دے رہے ہیں کہ وہ اپنے اعتقاد کے خلاف عمل کرنے کی خُوگر ہو جائے۔ کیا کوئی شخص یہ سمجھتا ہے کہ یہ تپ دق کی بیماری جو ہماری مذہبی زندگی میں پھیلائی جا رہی ہے، صرف مذہب کے دائرے تک ہی محدود رہ جائے گی؟ ہماری پوری قومی عمارت کو کھوکھلا کر کے نہ رکھ دے گی؟ جو مسلمان خدا اور رسولؐ کے ساتھ مخلص نہ رہے اُس سے آپ کیا توقع رکھتے ہیں کہ وہ قوم، وطن، ریاست اور کسی دوسری چیز کے لیے مخلص ثابت ہو سکے گا؟

اس میں خطرے کا یہ پہلو بھی ہے کہ غیر اسلامی اخلاق و اطوار کو رواج دینے کی کوششیں جتنی زیادہ بڑھ رہی ہیں، ملک کے دین پسند عناصر میں اُن کے مقابلے اور مزاحمت کا جذبہ بھی اتنا ہی زیادہ بڑھتا جا رہا ہے، اور اس چیز نے ملک کو صریح طور پر دو کیمپوں میں بانٹ دیا ہے۔ ایک اسلامی کیمپ اور دوسرا غیر اسلامی کیمپ۔ غور کرنے کی بات ہے کہ یہ وقت، جب کہ ہماری نئی مملکت ابھی ابھی قائم ہوئی ہے آیا اس بات کا متقاضی تھا کہ ہم اس کی تعمیر و ترقی میں مل جل کر اپنی ساری قومی طاقت صرف کر دیتے، یا اس بات کا کہ ہم دو کیمپوں میں بٹ کر اپنی طاقتیں آپس کی کش مکش میں صَرف کرتے؟ کچھ سوچیے کہ یہ کش مکش ہمیں کدھر لے جا رہی ہے اور آخر کہاں پہنچا کر چھوڑے گی؟

● **اخلاقی حالت**: دین کے بعد ہماری نگاہ میں دوسری چیز جو سب سے زیادہ اہمیّت رکھتی ہے، اخلاق ہے۔ اس حیثیت سے جب ہم ملک کی حالت کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ ہمارا عام اخلاقی انحطاط حقیقت میں ہمارے اس ملک کے لیے خطرہ نمبر۲ ہے۔

ملک کے تمام طبقے کیرکٹر کے بودے پن اور بے ضمیری میں مبتلا ہیں۔ اخلاقی خرابیاں ایک وبا کی طرح پھیل رہی ہیں۔ تمام اخلاقی حدود توڑ کر رکھ دی گئی ہیں اور عام طور پر لوگوں کے دلوں سے یہ احساس مٹتا جا رہا ہے کہ اخلاق بھی کوئی چیز ہے جس کے تقاضوں کا کچھ لحاظ آدمی کو کرنا چاہیے۔ عوام ہوں یا تعلیم یافتہ حضرات، سرکاری افسر اور اہل کار ہوں یا سیاسی لیڈر اور پارٹیوں کے

کارکن، اخبارنویس ہوں یا اہلِ قلم، تاجر ہوں یا اہلِ حرفہ، زمین دار ہوں یا کسان، جس طبقے کو دیکھیے، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ اخلاقی ذمہ داریوں کو بھول چکا ہے اور کسی ایسی حد سے واقف نہیں رہا ہے جس پر وہ اپنی اغراض وخواہشات کے پیچھے دوڑتے ہوئے رُک جائے۔ ہر شخص اپنا مطلب حاصل کرنے کے لیے ہر بدتر سے بدتر ذریعہ اختیار کرنے پر تُلا ہوا ہے۔ حرام اور حلال کی تمیز اُٹھ چکی ہے۔ گناہ اور ثواب کا احساس مٹ گیا ہے۔ بُرائی اور بھلائی کے فرق سے نگاہیں بند کر لی گئی ہیں۔ لوگوں کے ضمیر نے ان کے ذاتی مفاد کے آگے سپر ڈال دی ہے۔ فرائض کو لوگ بھول چکے ہیں اور حقوق سب کو یاد ہیں۔ جھوٹ اور فریب اور چال بازی کام نکالنے کے مقبول ترین ہتھیار بن گئے ہیں۔ رشوت اور خیانت اور حرام خوری کے دوسرے ذرائع شیرِ مادر کی طرح حلال ہوگئے ہیں۔ مال والوں کے مال ضمیروں اور عصمتوں اور شرافتوں کے خریدنے میں صَرف ہو رہے ہیں اور بیچنے والے دھڑلے سے اخلاق کے وہ سارے جوہر بیچ رہے ہیں جو اُن کی نگاہ میں روپے سے کم قیمت رکھتے ہیں۔

مَیں اِس کو اِس ملک کے لیے خطرۂ عظیم سمجھتا ہوں۔ کیرکٹر ہی وہ اصل طاقت ہے جس کے بل پر کوئی قوم زندہ رہ سکتی ہے اور ترقی کر سکتی ہے۔ اگر اس طاقت سے ہم محروم ہو جائیں، اگر ہمارے اخلاق کی جان نکل جائے اور ہم بالکل حدود سے ناآشنا ہو کر رہ جائیں، تو ترقی کرنا تو درکنار ہم ایک آزاد قوم کی حیثیت سے زندہ بھی نہیں رہ سکتے۔ (رُوداد جماعت اسلامی، ششم، ص ۶۱-۶۶)

ترجمان القرآن کے پیغام کی اشاعت میں حصہ لیجیے

ایجنسی لیجیے اور اپنے اعزہ و احباب میں، اہل محلہ اور رفقاے دفاتر میں

بازار کے دکان داروں میں، کالجوں، اسکولوں اور مدارس میں فروخت کیجیے

5 سے زائد پرچوں پر 25فی صد ◆ 25 سے زائد پرچوں پر 33فی صد

مینیجر ماہنامہ ترجمان القرآن، ۳۴-زینب پارک، نزد منصورہ، لاہور-۵۴۷۹۰۔ فون: ۳۵۴۲۷۹۱۶-۰۴۲

دعوتِ دین کا قرآنی اُسلوب

علامہ یوسف القرضاوی/ترجمہ: ارشاد الرحمٰن

قرآنِ مجید نے دعوتِ الی اللہ کے طریق کار کے کچھ خطوط، ذرائع اور وسائل بیان کیے ہیں۔ یہ وسائل ایک مسلم داعی کو اس کی ذمہ داری کی ادایگی اور پیغام رسانی میں مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ قرآن مجید نے اسے اپنے معجز بیان اسلوب کی بنیاد پر چند الفاظ میں سمیٹ کر بیان کر دیا ہے: اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَۃِ وَ الْمَوْعِظَۃِ الْحَسَنَۃِ وَ جَادِلْھُمْ بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ ط اِنَّ رَبَّکَ ھُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِیْلِہٖ وَ ھُوَ اَعْلَمُ بِالْمُھْتَدِیْنَo (النحل ۱۶: ۱۲۵) ''اے نبیؐ! اپنے رب کے راستے کی طرف دعوت دو حکمت اور عمدہ نصیحت کے ساتھ اور لوگوں سے مباحثہ کرو ایسے طریقے پر جو بہترین ہو۔ تمھارا رب ہی زیادہ بہتر جانتا ہے کہ کون اس کی راہ سے بھٹکا ہوا ہے اور کون راہِ راست پر ہے''۔ اس لحاظ سے دیکھیں تو سورۃ النحل کی مذکورہ آیت محفوظ ترین دینی اندازِ خطاب یا دعوتِ دین کے مطلوب طریق کار کے خطوط وضع بھی کرتی ہے اور انھیں واضح بھی کرتی ہے۔

● **دعوتِ دین ہر مسلمان کی ذمہ داری**: ان خطوط میں سے پہلا نکتہ یہ ہے کہ داعی کو اس بات کا بخوبی علم ہو کہ دین کی دعوت پیش کرنا ہر مسلمان کی ذمہ داری ہے۔ اس دعوت کا تقاضا اللہ تعالیٰ نے ہر فرد سے کیا ہے۔ ہر مسلمان کو کسی نہ کسی صورت میں اور کسی نہ کسی طریقے سے اپنے دین کی دعوت کو پیش کرنے کا حکم ہے۔ قُلْ ھٰذِہٖ سَبِیْلِیْٓ اَدْعُوْٓا اِلَی اللّٰہِ عَلٰی بَصِیْرَۃٍ اَنَا وَ مَنِ اتَّبَعَنِیْ (یوسف ۱۲: ۱۰۸) ''تم ان سے صاف کہہ دو کہ ''میرا راستہ تو یہ ہے، میں اللہ کی طرف بلاتا ہوں، میں خود بھی پوری روشنی میں اپنا راستہ دیکھ رہا ہوں اور میرے ساتھی بھی''۔

دعوت کے اس کام اور ذمہ داری کی صورتیں دراصل ہر شخص کی استطاعت اور امکان کے

مطابق مختلف ہوتی ہیں۔ کوئی شخص کتاب لکھ کر دعوت الی اللہ کا کام کر رہا ہوتا ہے۔ کوئی یونی ورسٹی یا کسی عوامی اجتماع میں لیکچر کے ذریعے یہ کام کرتا ہے۔ کوئی مسجد میں خطبۂ جمعہ یا درسِ قرآن کے ذریعے دعوتِ دین پیش کرتا ہے۔ کوئی میٹھی زبان، بہترین دوستی اور اپنی زندگی کا بہترین نمونہ و کردار پیش کر کے اللہ تعالیٰ کی طرف بلانے کا باعث بنتا اور اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہوتا ہے۔ مال دار اور اہلِ خیر و ثروت داعیانِ دین پر خرچ کر کے یا ان کی علمی و دینی ابلاغیات کو اپنے خرچ کے ذریعے عام یا کسی اسلامک سنٹر کو تعمیر کر کے یہ خدمت انجام دیتے ہیں۔ جس طرح نبی کریمؐ نے فرمایا ہے: ''جس شخص نے راہِ خدا میں مصروفِ جہاد مجاہد کی تیاری کا سامان فراہم کیا گویا اس نے خود جہاد کیا ہے'' (بخاری، مسلم)۔ ہم رسولِ کریمؐ کے اس فرمانِ گرامی پر قیاس کرتے ہوئے کہتے ہیں: جس نے داعی الی اللہ کی تیاری کا سامان فراہم کیا گویا اُس نے خود دعوتِ دین کا فریضہ انجام دیا۔

● **ربانی راستے کی طرف ربانی دعوت**: اس دعوتی خاکے کا دوسرا نکتہ یہ ہے کہ داعی کو یہ یقین حاصل ہو کہ وہ سبیل اللہ کی طرف، یعنی اللہ کے منہج کی طرف انسانوں کو بلا رہا ہے۔ وہ طریقہ، راستہ، منہج اور نظام جو اللہ تعالیٰ نے انسانیت کی ہدایت کے لیے اس لیے وضع کیا ہے کہ وہ اللہ وحدہٗ کی عبادت بہترین طریقے سے کرسکیں۔ انسانوں کے باہمی معاملات خوش اسلوبی کے ساتھ انجام پائیں۔ اس طرح وہ دنیا اور آخرت کی بہترین کامیابی کے حق دار ٹھیریں۔

ایک مسلمان داعی انسانوں کو اپنی ذات اور اپنے قبیلے، کنبے اور قوم برادری کی طرف نہیں بلاتا۔ وہ انھیں اللہ وحدہ کی طرف بلاتا ہے جو پوری کائنات کا خالق اور رب ہے۔ اس بنیادی اصول کو قرآنِ مجید نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے: ''کسی انسان کا یہ کام نہیں ہے کہ اللہ تو اس کو کتاب اور حکم اور نبوت عطا فرمائے اور وہ لوگوں سے کہے کہ اللہ کے بجائے تم میرے بندے بن جاؤ۔ وہ تو یہی کہے گا کہ سچّے ربانی بنو جیسا کہ اُس کتاب کی تعلیم کا تقاضا ہے جسے تم پڑھتے اور پڑھاتے ہو۔ وہ تم سے ہرگز یہ نہ کہے گا کہ فرشتوں کو یا پیغمبروں کو اپنا رب بنالو۔ کیا یہ ممکن ہے کہ ایک نبیؑ تمھیں کفر کا حکم دے جب کہ تم مسلم ہو؟'' (اٰل عمرٰن ۳:۷۹-۸۰)

وہ نہ کسی انسانی نظام کی طرف بلاتا ہے اور نہ کسی زمینی فلسفے کا پرچار کرتا ہے۔ وہ کسی ایسے مصنوعی قانون کی طرف دعوت نہیں دیتا جو کسی شہنشاہ یا بادشاہ کے حکم پر تشکیل دیا گیا ہو۔ وہ کسی

ملک، قوم یا جماعت کے وضع کردہ قانون کا داعی نہیں ہوتا بلکہ وہ تو انسانوں کو انسانوں کی غلامی سے نجات حاصل کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ اسلام میں کسی انسان کو یہ اختیار حاصل نہیں ہے کہ وہ انسانوں کے لیے دائمی اور مطلق قانون سازی کر سکے اور جس چیز کو چاہے انسانوں کے لیے حلال قرار دے اور جسے چاہے حرام ٹھیرا دے۔ اہلِ کتاب کے ہاں تاریخ کے ایک دور میں یہی کچھ ہوتا رہا ہے۔ قرآنِ مجید نے اس چیز کو سخت ناپسند قرار دیتے ہوئے فرمایا: اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَ رُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَ الْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ ۚ وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوْٓا اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۭ سُبْحٰنَهٗ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ (التوبہ ۹:۳۱) ”انھوں نے اپنے علما اور درویشوں کو اللہ کے سوا اپنا رب بنالیا ہے اور اسی طرح مسیحؑ ابن مریمؑ کو بھی۔ حالانکہ ان کو ایک معبُود کے سوا کسی کی بندگی کرنے کا حکم نہیں دیا گیا تھا۔ وہ جس کے سوا کوئی مستحق عبادت نہیں، پاک ہے وہ اُن مشرکانہ باتوں سے جو یہ لوگ کرتے ہیں“۔ اب یہ دور آ گیا ہے کہ انسان اپنے ہی جیسے انسانوں کی غلامی سے آزاد ہو جائیں، ان کی ربوبیت سے باہر آ جائیں اور تمام تر انسان اس اللہ وحدہٗ کے بندے بن جائیں۔ جس اللہ نے انھیں تخلیق فرمایا اور زمین و آسمان کی ہر چیز اُن کی خدمت اور استعمال کے لیے مسخر کر دی، انھیں اپنی ظاہری اور پوشیدہ ہر طرح کی نعمتوں سے نوازا۔

یہی وجہ ہے کہ اہلِ کتاب (یہودی و نصرانی) حکمرانوں کے نام نبی کریمؐ کے مکتوبات قرآنِ مجید کی اس آیت پر ختم ہوتے ہیں: قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيْنَنَا وَ بَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَ لَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْئًا وَّ لَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ (اٰل عمرٰن ۳:۶۴) ”اے نبیؐ، کہو ”اے اہلِ کتاب، آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو ہمارے اور تمھارے درمیان یکساں ہے، یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کریں، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھیرائیں، اور ہم میں سے کوئی اللہ کے سوا کسی کو اپنا رب نہ بنائے“۔

مسلم مخاطبین کے لیے دعوت کا اُسلوب

اسلام کی دعوت کے طریق کار کا تیسرا نکتہ یہ ہے کہ جب اس دعوت کے مخاطب مسلمان ہوں تو انھیں دو انداز سے یہ دعوت پیش کی جائے: ۱- حکمت کے ساتھ ۲- موعظۂ حسنہ کے ساتھ۔

- **حکمت پر مبنی انداز (حکمة)**: ’حکمت‘ سے مراد ہے: ظاہر و باہر عقلی براہین اور

اطمینان بخش علمی دلائل کے ذریعے ذہنوں کو مخاطب کرنا، یعنی ایسے دلائل و براہین جو حتمی و قطعی اور ٹھوس شواہد کی بناپر شبہات کا ازالہ کر دیں، جو متشابہات کو محکمات میں، ظنیات کو قطعیات میں، جزئیات کو کُلیات میں اور فروعات کو اصولوں میں بدل دیں۔

اسی طرح ایسے انداز اور اسلوب سے لوگوں کو مخاطب کرنا بھی حکمت ہی کا حصّہ ہے کہ لوگ بات کو سمجھ جائیں، بات اُن کے دل و دماغ میں اُتر جائے۔ ایسا طریقہ اور اسلوب، حکمت نہیں کہلاسکتا جس سے لوگ بات ہی نہ سمجھ پائیں۔ حضرت علیؓ کا قول ہے: لوگوں سے ایسے طریقے سے گفتگو کرو جس سے وہ بات کو سمجھ سکیں، اور ایسا طریقہ اختیار نہ کرو جس کو وہ پسند نہ کرتے ہوں۔ کیا تم یہ پسند کر سکتے ہو کہ تمھارے ناپسندیدہ طریقے کی بناپر اللہ و رسولؐ کی بات کو جھٹلا دیا جائے؟

یہ بات بھی حکمت میں سے ہے کہ لوگوں سے گفتگو اُن کی زبان میں کی جائے تاکہ وہ بات کو بخوبی سمجھ سکیں۔ اللہ تعالیٰ نے اسی لیے تو فرمایا ہے: وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ ط (ابراہیم ۱۴:۴) ’’ہم نے اپنا پیغام دینے کے لیے جب کبھی کوئی رسول بھیجا ہے، اس نے اپنی قوم ہی کی زبان میں پیغام دیا ہے تاکہ وہ انھیں اچھی طرح کھول کر بات سمجھائے‘‘۔

اس آیت کا معنی صرف یہی نہیں ہے کہ چینیوں سے چینی زبان میں، روسیوں سے روسی زبان میں اور کسی اور قوم سے اُسی کی زبان میں بات کی جائے بلکہ اس آیت کا کچھ زیادہ گہرا مفہوم و معنی یہ ہے کہ خواص سے خواص کی زبان میں اور عوام سے عوام کی زبان میں بات کی جائے۔ اہلِ مشرق سے مشرقی زبانوں میں گفتگو کی جائے اور اہلِ مغرب سے مغربی زبانوں میں خطاب کیا جائے۔ اکیسویں صدی کے لوگوں سے حال کی زبان میں بات کی جائے نہ کہ ماضی کی ایسی زبان میں جو متروک ہو چکی ہو اور اس کے سمجھنے سے لوگ قاصر ہوں۔

اسلوبِ دعوت کا یہ پہلو بھی حکمت میں شامل ہے کہ ہم اوامر و نواہی کے معاملے میں لوگوں کے ساتھ نرمی اختیار کریں۔ اوامر و نواہی پر عمل پیرا ہونے کے لیے ان کے ذہنوں اور دلوں کو تیار کریں۔ پہلے ہی مرحلے میں اُن سے ہر چیز کا تقاضا نہ کریں۔ ہمیں تو دین کی دعوت و تعلیم کے معاملے میں اُس نبویؐ طریق کار کو اختیار کرنا ہے جس کا آپؐ نے اپنی اُمت کو حکم دیا ہے۔ فرمایا: ’’آسانیاں پیدا کرو، مشکلات کھڑی نہ کرو، لوگوں کو دین سے متنفر نہ کرو‘‘ (بخاری، مسلم)۔

لوگوں کو ایسا کام کرنے پر مجبور نہ کرو جس کو انجام دینے کی وہ استعداد نہ رکھتے ہوں، اس لیے کہ کہیں وہ آپ کے احکامات کو رد نہ کردیں اور یہ کہیں کہ ہم نے آپ کی بات سن لی ہے مگر ہم نہیں مانتے۔ رسول کریمؐ نے تو فرمایا ہے: ''جب میں تمھیں کوئی حکم دوں تو تم اپنی استطاعت اور استعداد کے مطابق اُس پر عمل کرو''۔ (بخاری، مسلم)

یہ بات حکمت کے خلاف ہے کہ ہم لوگوں سے کسی فروعی امر پر بات کریں، جب کہ وہ اُس امر کے اصل ہی کو نہ مانتے ہوں، مثلاً آپ لوگوں کو نفلی صدقات کرنے کے لیے کہیں مگر وہ تو زکوٰۃ بھی روک کر بیٹھے ہوں۔ آپ اُنھیں نمازِ اشراق کی تلقین کریں، جب کہ وہ فرض نماز بھی ادا نہ کرتے ہوں، یا آپ اُن کا عقیدہ پختہ کرنے سے قبل اُن سے اوامر ونواہی پر بحث کریں۔

حضرت عبداللہ ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسولؐ اللہ نے جب حضرت معاذ بن جبلؓ کو یمن کا گورنر بنا کر بھیجا تو انھیں فرمایا: معاذ تم اہلِ کتاب قوم کی طرف جا رہے ہو۔ تم سب سے پہلے انھیں اللہ کی عبادت کی دعوت دینا (ایک روایت میں لا الٰہ الا اللہ کی شہادت کا ذکر ہے)۔ جب وہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں جان لیں تو پھر انھیں بتاؤ کہ اللہ نے اُن پر دن رات میں پانچ نمازیں فرض کی ہیں۔ جب وہ نماز ادا کرنا شروع کر دیں تو پھر انھیں بتانا کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کے مال و دولت میں زکوٰۃ فرض کی ہے جو اُن کے مال داروں سے لے کر غریبوں میں تقسیم کردی جائے گی''۔ (بخاری)

دیکھیے نماز کی فرضیت اُس وقت بتائی ہے جب وہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں معرفت حاصل کر چکے ہوں اور یہ حکمت کا ایک پہلو ہے کہ پہلے ہم اصول اور بنیادوں کو قائم اور مستحکم کریں، پھر فروع اور تفصیلات کی طرف بلائیں۔ ہمارے اسلاف نے بہت پہلے یہ کہا تھا: ''ہم کسی مقصد کو حاصل کرنے میں اُسی وقت ناکام ہوتے ہیں جب اصولوں کو ضائع کر دیں''۔

یہ بات بھی حکمت کے پہلو بہ پہلو چلتی ہے کہ جب لوگ فرائض کی ادایگی میں کوتاہی کر رہے ہوں تو نوافل کی ادایگی پر شدت اختیار کرنا مناسب نہیں۔ ہماری علمی وراثت کے قواعد میں یہ چیز موجود ہے کہ اللہ تعالیٰ اس وقت تک نفل قبول نہیں کرتا جب تک فرائض ادا نہ کیے جائیں۔ اسلاف کا قول ہے کہ جس کو فرائض کی ادایگی نے نفل ادا کرنے سے روکا وہ تو معذور (قابلِ معافی) ہے اور جس کو نفل کی ادایگی نے فرائض ادا نہ کرنے دیے وہ مغرور (دھوکے میں) ہے۔

اختلافی مسائل کی بحثوں میں اُلجھے رہنا، جب کہ لوگ متفق علیہ اُمور و مسائل کو ہی ضائع کیے بیٹھے ہوں، بھی اسی زمرے میں شامل ہے۔ مثلاً: عورت کا نقاب کے ذریعے چہرے کو چھپانا اور چادر (جسے آج کل حجاب بھی کہا جاتا ہے) کو کافی نہ سمجھنا، اور اس عورت کو گناہ کی مرتکب سمجھنا جو صرف دوپٹا اوڑھتی ہو۔ یہ چیز اس لیے غیر اہم ہے کہ آج ہم مسلم قوم جس معرکے سے دوچار ہیں وہ چہروں کو نہ چھپانے اور نہ ڈھانپنے کا معرکہ نہیں ہے بلکہ معاملہ تو اس سے بہت آگے جاچکا ہے۔ آج تو نہ صرف سروں اور سینوں کو، بازوؤں اور پنڈلیوں کو نہ ڈھانپنے کی یلغار کا سامنا ہے بلکہ مختصر اور نیم عریاں ملبوسات کا بھی رواج ہے۔ بالفاظِ حدیث ہم ان لباسوں میں ایسی عورتیں دیکھتے ہیں جو کپڑے پہن کر بھی ننگی ہی ہوتی ہیں، دوسروں کو رجھاتی اور خود دوسروں پر ریجھتی ہیں۔

یہ بات بھی اس مطلوب حکمت میں شامل ہے کہ ہم دینی اُمور میں ترجیحات کا خیال رکھیں۔ احکام (اوامر) میں ہم عقائد کو اعمال پر مقدم ٹھیرائیں۔ رکن فرائض کو دیگر فرائض پر ترجیح دیں۔ واجبات کو سنتوں پر مقدم جانیں۔ مؤکدہ سنتوں کو مستحبات اور غیر مؤکدہ سنتوں پر ترجیح دیں۔ منہیات (نواہی و ممنوعات) میں کفر سے جنگ اور معرکے کو دیگر معرکوں سے اہم سمجھیں۔ کبیرہ گناہوں کے خلاف جدوجہد کو صغیرہ گناہوں کے خلاف جدوجہد پر ترجیح دیں۔ شبہات و مکروہات سے زیادہ محرمات کو مدنظر رکھیں، اختلافی اُمور سے زیادہ متفقہ اُمور کو اہمیّت دیں۔

دعوتِ دین کو تدریج کے ساتھ پیش کرنا بھی حکمت ہے۔ تدریج جس طرح تکوینی سنت و قانون ہے اسی طرح شرعی سنت اور قاعدہ بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم فرمایا کہ لوگوں کے ذہنوں میں آپؐ سب سے پہلے عقائد اور اخلاقی اصولوں کو راسخ کریں۔ اس بات کو ہم مکّی دور میں نازل ہونے والے قرآن میں واضح طور پر دیکھ سکتے ہیں۔ پھر اس کے بعد عملی پہلو کی طرف توجہ کی گئی اور تدریج کے ساتھ ایک کے بعد دوسری چیز کا حکم دیا گیا۔ نماز قائم کرنے سے آغاز کیا گیا اور نماز ہجرت سے قبل فرض تھی۔ پھر ہجرت کے بعد دوسرے سال زکوٰۃ اور رمضان کے روزوں کو فرض کیا گیا۔ پھر اس کے بعد مالی استطاعت رکھنے والے پر حج فرض کیا گیا۔

اسی طرح پہلے اُن چیزوں کو حرام قرار دیا گیا جو متفقہ طور پر انسانی رذائل میں شمار ہوتی ہیں۔ جنھیں انسانی زندگی میں فتنہ و فساد اور انارکی کے اسباب سمجھا جاتا ہے۔ مثلاً: انسانی جان کو قتل کرنا،

زنا جیسی بے حیائی کا مرتکب ہونا، اولاد کو درپیش یا متوقع افلاس کے خوف سے مار ڈالنا، یتیم کا مال کھا جانا، معاہدوں کو توڑ دینا، زمین پر غرور اور تکبر کے ساتھ چلنا پھرنا___ اسی طرح کی اور بہت سی چیزیں پہلے حرام کی گئیں جو انسانی زندگی کے قانونی پہلو کی نسبت اخلاقی پہلو سے زیادہ قریب ہیں۔

میں نے دیکھا ہے کہ دعوت پیش کرنے والے کئی بھائی اپنے مخاطبین سے گفتگو اور دعوت کے معاملے میں بالکل تدریج کو ملحوظ نہیں رکھتے۔ بوسنیا، ہرزیگووینا اور کوسووا جیسے بہت سے علاقوں میں کمیونزم کے خاتمے کے بعد جہاں مسلمان ۵۰ سال تک موجود رہے مگر یہ علاقے تہذیب و ثقافت اور عمل و کردار کے اعتبار سے اسلام سے کٹے رہے۔ وہ تو اسلام کی الف با سے بھی واقف نہیں۔ یہ لوگ اس بات کے ضرورت مند ہیں کہ ہم ان کو حکیمانہ تدریجی طریقے سے اسلام سکھائیں اور پھر عمل پیرا کرائیں۔ ایسے لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے ہم عقائد و احکام کے معاملے میں صرف اُن امور سے آغاز کریں جو تمام مسلمانوں کے نزدیک متفقہ ہیں نہ کہ اُن باتوں میں ابتدا ہی سے اُلجھانا شروع کر دیں جن میں اختلاف ہے۔ لیکن بعض دعوتی کارکنان اس بات کو پیش نظر نہیں رکھتے اور وہ اُن عقائد سے دعوت کا آغاز کرتے ہیں جن کو جمہور مسلمانوں نے مشرق و مغرب میں قبول کر رکھا ہے اور دینی مدارس و جامعات میں ان عقائد کی تدریس دنیا بھر میں کرا رہے ہیں۔ اس لیے کہ آج ہماری جنگ اس سے نہیں ہے جو اللہ تعالیٰ اور اس سے ملاقات و حساب کتاب پر تو ایمان رکھتا ہے مگر یدُ اللہ (اللہ کے ہاتھ) سے مراد اللہ کی قدرت لیتا ہے، یا وَسِعَ کُرْسِیُّہُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ کے بارے میں کہتا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی مِلک و سلطانی کی وسعت کا کنایہ ہے۔ ہماری حقیقی جنگ تو اُن ملحدین سے ہے جو اللہ کے وجود ہی کے سرے سے منکر ہیں اور کہتے ہیں کہ کوئی اللہ اور الٰہ نہیں ہے، زندگی بس مادے کا نام ہے۔ یہ لوگ صرف اتنا کہنے پر بس نہیں کرتے بلکہ اُن لوگوں کے خلاف برسرِ جنگ ہیں جو اللہ کو اپنا رب مانتے ہیں۔

ہمارے ان مخلص اور اچھے دعوتی کارکنوں نے دعوت کا آغاز ہی ان باتوں سے کیا کہ مرد داڑھی لمبی رکھیں اور لباس کے طور پر کم سے کم کپڑا استعمال کریں۔ عورتیں نقاب پہن لیں، بعض کارکنانِ دعوت نے تو اپنے ساتھ ہزاروں نقاب بھی اُٹھا رکھے تھے تاکہ اُن خواتین کو پہنا دیں جو اُن کی دعوت کی مخاطب ہیں۔ لیکن سوچنے کی بات ہے کہ ابھی ان خواتین کو چادر تک لانے میں بھی

کئی مراحل موجود تھے جو ابھی طے ہونا باقی تھے۔ پہلے یہ مراحل طے ہوتے اور پھر اُن کو نقاب کے لیے کہا جاتا تو اُنھیں بات کو قبول کرنے میں آسانی رہتی۔ جب ہمیں دیارِ اسلام کے قلب عرب میں بھی داڑھی نہ رکھنے کا مسئلہ درپیش ہے تو کیا یہ مناسب ہے کہ اُن یورپی مسلمانوں کو اسلام کی دعوت پیش کرنے کا آغاز ہی داڑھی رکھنے کے مطالبے سے کریں؟ حالانکہ یہ لوگ تو نصف صدی تک کمیونزم کے چنگل میں پھنسے رہے اور ہم خود اسلامی و عرب ممالک میں بھی اس کمیونزم کا مقابلہ کرنے میں ناکام رہے۔ پھر یہ بات بھی اہم ہے کہ کیا داڑھی کو کھلا چھوڑ دینا ارکانِ اسلام میں سے یا فرائض اسلام میں سے ہے کہ ہم اسی سے آغاز کریں اور دین میں اسے اس قدر اہمیّت دیں؟

ہمارے یہ بہترین داعی بعض جگہوں پر دعوت کا آغاز مکمل تصوف کے خلاف جدوجہد سے کرتے ہیں۔ یہ الزام دیتے ہیں کہ یہ اسلام میں اضافہ ہے۔ اس معاملے میں وہ سُنّی اور بدعتی اور راہِ مستقیم پر گامزن اور انحراف میں مبتلا ہوجانے والوں کے درمیان کوئی فرق ہی نہیں کرتے۔

یہاں تو ضرورت اُمت کو عمومی طور پر اور ان قوموں کو خصوصی طور پر ایسی ربانی تربیت کے ذریعے درست کرنے کی ہے جو تربیت انھیں عصرِ حاضر کی مادی جہنّم سے نجات دلا سکے۔ جس مادی جہنّم نے انسانیت کو آخرت سے غافل کر کے دنیا میں مست کر رکھا ہے، خالق کے بجاے مخلوق میں گم کر دیا ہے، روح کے بجاے مادے میں اُلجھا دیا ہے۔ ایمانی اخلاقی تربیت ہی تو اس صحیح تصوف کا جوہر ہے جس کے بارے میں کسی نے کہا ہے کہ یہ اللہ کے ساتھ اخلاص اور مخلوق کے ساتھ اخلاق اختیار کرنے کا نام ہے۔ دوسرے الفاظ میں یہ اللہ تعالیٰ کا خوف، یعنی تقویٰ اختیار کرنے اور انسانوں کے ساتھ احسان کا معاملہ کرنے کا نام ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی طرف اشارہ ہے: ''اللہ اُن لوگوں کے ساتھ ہے جو تقویٰ سے کام لیتے ہیں اور احسان پر عمل کرتے ہیں''۔(النحل ۱۶:۱۲۸)

حکمت کا یہ پہلو بھی داعیانِ دین کو اپنی دعوتی سرگرمیوں اور جدوجہد میں پوری طرح اختیار کرنا چاہیے کہ وہ اپنے مخاطبین اور روابط کو نرمی اور رحیمانہ جذبات کے ساتھ مخاطب کریں۔ ان خوبیوں سے رسولِؐ کریم کے آراستہ ہونے کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ''(اے پیغمبرؐ) یہ اللہ کی بڑی رحمت ہے کہ تم ان لوگوں کے لیے بہت نرم مزاج واقع ہوئے ہو ورنہ اگر کہیں تم تندخُو

اور سنگ دل ہوتے تو یہ سب تمھارے گردوپیش سے چھٹ جاتے‘‘ (اٰل عمرٰن ۳:۱۵۹)۔غور کیجیے کہ یہ وحی کے ذریعے تائید و نصرت پانے والے رسول اور نبی کریمؐ ہیں جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا ہے۔ جب رسولؐ اللہ کا معاملہ یہ ہے تو عام داعی کی طرف سے شدت و سختی انسانوں کے لیے کیسے قابلِ قبول ہوسکتی ہے؟

● **بہترین ناصحانہ انداز (موعظۃ حسنہ)**: جس طرح حکیمانہ اسلوبِ دعوت عقل کو مخاطب کرتا ہے تو اسے مطمئن کر دیتا ہے، اسی طرح بہترین اندازِ دعوت دلوں اور جذبات و احساسات کو مخاطب کرے تو انھیں متحرک و متاثر کرتا ہے۔ انسان صرف عقل ہی کا نام نہیں ہے بلکہ وہ عقل اور قلب دونوں کا نام ہے۔ انسان عقل سے چیزوں کے بارے میں سوچتا اور اُن کا اِدراک کرتا ہے، جب کہ دل سے محسوس کرتا اور شعور میں لاتا ہے۔ داعیانِ دین کے لیے ضروری ہے کہ ان دونوں چیزوں کو ایک ساتھ مخاطب کریں۔ گویا اس چیز کو بھی مخاطب کریں جو غوروفکر کر کے معرفت حاصل کرتی ہے اور اس چیز کو بھی مخاطب کریں جو جذبات میں آتی اور ارادہ کرتی ہے۔ کسی چیز کو پسند و ناپسند کرتی اور اس میں دل چسپی وعدم دل چسپی کا مظاہرہ کرتی ہے۔

قرآنِ مجید نے حکمت کی کوئی صفت بیان نہیں کی۔ اس لیے کہ حکمت جسے بھی عطا ہوجائے اس کو خیرِ کثیر عطا ہوگئی۔ مگر قرآنِ مجید نے مطلوب ناصحانہ انداز کو لفظ ’بہترین‘ کے ساتھ بیان کیا ہے، یعنی موعظہ حسنہ۔ یہاں محض سادہ نصیحت اور سادہ وعظ مطلوب نہیں ہے بلکہ بہترین وعظ وتذکیر اور ناصحانہ انداز کا مطالبہ ہے۔ کبھی یہ حُسن وخوب صورتی مخاطب کے لیے بہترین موضوع کا انتخاب کرنے میں دکھائی دیتی ہے۔ کبھی مؤثر اندازِ بیان اختیار کرنے میں سامنے آتی ہے۔ بسا اوقات موقع ومحل کے بہترین انتخاب میں یہ حُسن نظر آتا ہے اور بعض اوقات موعظتِ حسنہ کا یہ حُسن مخاطبین کے دلوں کے تار ہلا کر انھیں اپنی بات سے متاثر کر لینے میں نظر آتا ہے۔ یہ حُسنِ موعظت وہاں بھی نظر آتا ہے جہاں داعی کی دعوت انسان کی کمزوری کا اندازہ کر لیتی ہے مگر یہ جان لینے کے بعد وہ کمزور انسان کی لغزش اور خطا کو دیکھ کر اُسے بُرا بھلا کہہ کر اس کے دل پر زخم نہیں لگاتا۔ اس لیے کہ ہر ابن آدم خطا کار ہے۔ راہِ خدا کے معاملے میں انسانوں کو جنت کا شوق دلانے اور جہنم سے خوف زدہ کرنے کے حوالے سے بھی اعتدال اور توازن کا یہ حُسن داعی کے پیغام میں نظر آتا ہے۔